انسانی پالوشن

جدید تمدن کا ایک بہت بڑا مسئلہ پالوشن (Pollution) ہے۔ یہ مسئلہ صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہوا ہے۔ جب انسان کی بنائی ہوئی مشینوں سے نکلنے والا دھواں اور مختلف قسم کے کیمیکل وغیرہ نے ہوا، مٹی اور پانی کو مختلف قسم کی آلودگیوں یا پالوشن سے بھر دیا ہے۔ یہ آلودگیاں انسانی صحت اور ماحول دونوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکی ہیں۔ اس خطرے پر قابو نہ پایا گیا تو یہ کرہ ارض پر انسان کا مستقبل بہت تاریک ہو جائے گا۔ چنانچہ دنیا بھر میں آلودگیوں کو کم کرنے اور قابو میں رکھنے کے لیے شعور سازی اور قانون سازی کی جارہی ہے۔

انسانی معاشروں کے لیے آلودگی کی ایک اور قسم بھی شدید نقصان کا باعث ہے۔ یہ آلودگی خارج کے بجائے انسانوں کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ آلودگی منفی اندازفکر سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کے اندر نفرت اور مایوسی کی شکل میں اپنا ظہور کرتی ہے۔

مایوسی کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ انسان سے عمل کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ وہ اسے خودغرض اور مفاد پرست بنادیتی ہے۔ ایسا شخص دن کی روشنی میں کھڑا ہو کر اندھیرا دیکھتا، ساحل سمندر پر گھٹن محسوس کرتا اور دریا کے کنارے پیاس سے تڑپتا رہتا ہے۔ جبکہ نفرت انسان سے ہمدردی، خیر خواہی، نرمی اور رحم جیسی اعلیٰ صفات چھین لیتی ہے۔ نفرت کا مریض آگ اگلتا، فساد پھیلاتا، عداوت اور جھگڑے میں اپنی توانائیاں خرچ کرتا اور نتیجتاً معاشرے کو ظلم و فساد سے بھر دیتا ہے۔

انسان کی زندگی امید اور محبت کی آکسیجن پر منحصر ہے۔ نفرت اور مایوسی کے مریض ان دونوں سے محروم ہوتے اور دوسروں کو محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خود پالوشن کا شکار ہوتے ہیں اور صحافت، دانشوری اور مذہب کے نام پر معاشرے میں بھی اسی پالوشن کو پھیلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی باتوں پر توجہ دینے کا نتیجہ نفسیاتی مریض بننے کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔

معرفت کیا ہوتی ہے؟

''معرفت کیا ہوتی ہے؟''، آج عارف کی مجلس میں گفتگو کا آغاز ایک صاحب کے سوال سے ہوا تھا۔ جواب میں عارف کی دلپذیر آواز بلند ہوئی۔

''معرفت علم کا کمال ہے۔ علم کا سفر جب شروع ہوتا ہے تو شک، تردید، اضطراب، تصحیح کی منازل سے گزرتا ہے۔ پھر علم احساس کی وادی میں قدم رکھتا ہے اور آخر کار یقین کے اس پڑاؤ پر ڈیرہ ڈالتا ہے، جسے معرفت کہتے ہیں۔''

''کسی مثال سے سمجھائیں؟''، یہ کہتے ہوئے ان صاحب کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔

''اللہ تعالیٰ کی صفت الوھاب کا مطلب کیا ہے؟''، عارف کے سوال پر جواب آیا:

''دینے والا، عطا کرنے والا۔''

''درست فرمایا آپ نے۔ یہ علم ہے۔ مگر جس وقت یہ علم اس احساس میں ڈھل جائے کہ پروردگار میری ہر ضرورت کی چیز دے سکتا ہے۔ اس یقین میں ڈھل جائے کہ اس لمحے بھی میرا رب اپنی دست عطا دراز کیے کسی خالی جھولی کا منتظر ہے۔ کیوں نہ میں ہی اپنی جھولی پھیلائے اس کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں۔ اور اس کے بعد آپ کا وجود سراپا دعا بن جائے۔ تو پھر یہ علم معرفت میں تبدیل ہو گیا۔

اس لمحے میں آپ کے دل کی آنکھیں آپ کو یہ منظر دکھا دیں گی کہ ہر سوالی جھولی بھر کر چلا گیا۔ سخی داتا کے خزانے ختم نہیں ہوئے۔ مانگنے والے ختم ہو گئے، مگر وہ ابھی بھی پکارے جا رہا ہے کہ ہے کوئی سوالی۔ یہ پکار سن کر آپ کو حوصلہ ہوا اور آپ بھی دست طلب دراز کیے دربار اقدس میں آ گئے۔ اس نے آپ پر نگاہ تبسم فرمائی اور خالی جھول بھر دی۔ بس یہی احساس معرفت ہے۔ یہی یقین معرفت ہے۔''، عارف کی صدا تھم گئی، معرفت کا ایک اور دریچہ سننے والوں پر کھول گئی۔

علم، احتساب اور اعتراف

ایمان اس روئے زمین پر جنم لینے والا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ایمان دراصل اعتراف کا نام ہے۔ یعنی جب سچائی سامنے آجائے تو اسے مان لینا۔ چاہے وہ اپنی خواہشات کے خلاف ہو یا جذبات کے۔

اپنے جذبات کے خلاف کسی حقیقت کا اعتراف کرنا اس دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو ذاتی احتساب کی نفسیات میں جی رہا ہے۔ جبکہ انسانوں کو معاملہ یہ ہوتا ہے کہ بیشتر لوگ دوسروں کے احتساب کے اصول پر زندگی گزارتے ہیں۔ دوسروں کے احتساب میں جینے والا اپنی پہاڑ جیسی غلطیاں بھی نہیں دیکھ پاتا البتہ دوسروں کی وہ غلطی بھی دریافت کر لیتا ہے جو موجود ہی نہیں ہوتی۔

ذاتی احتساب کی نفسیات انسان کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ بولنے سے پہلے تولے اور بولنے کے بعد دوبارہ سوچے کہ کیا کہا ہے۔ اس کے باجود بھی غلطی ہوجائے تو توجہ دلانے پر فوراً اپنی اصلاح کرتا ہے۔ وہ تنقید کو اصلاح کا عمل سمجھ کر خوشدلی سے برداشت کرتا ہے۔

احتساب کے بعد اعتراف کی طرف لے جانے والی دوسری چیز علم کا حصول اور چیزوں کو درست زاویے سے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ بعض اوقات انسان جہالت کی وجہ سے بہت سی سچائیوں کو نہیں مانتا۔ بعض اوقات انسان کو کسی بات کا علم ہوتا ہے، مگر جس زاویے سے اس بات کو دیکھ رہا ہوتا ہے وہی غلط ہوتا ہے۔ لہٰذا جب کسی فن کا ماہر یا صاحب علم تصحیح کر دے تو انسان کو اپنی غلطی پر اڑے رہنے کے بجائے اعتراف کر لینا چاہیے۔

اللہ کی جنت اعتراف پر مبنی نفسیات کا بدلہ ہے۔ یہ جس شخص میں موجود ہو انانیت اور تعصّبات دونوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد خدا کی رحمت اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔

سیلاب: رحمت یا زحمت

پاکستان ایک دفعہ پھر سیلاب کی زد میں ہے۔سیکڑوں لوگ مارے جاچکے ہیں۔ ہزاروں ایکڑ زرعی اور رہائشی زمین زیرِآب آچکی ہے ۔لاکھوں لوگ متاثر ہوچکے ہیں۔

پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا اور آخری سیلاب نہیں۔ فیڈرل فلڈ کمیشن کے مطابق پاکستان میں اب تک دو درجن بڑے سیلاب آئے ہیں۔ان میں سب سے بڑا سیلاب 2010 کا تھا۔ یہ وہی سیلاب تھا جس میں بعض نادان مذہبی دانشوروں نے یہ غیر ضروری بحث اٹھادی کہ یہ اللہ کا عذاب ہے۔ہم نے اُس وقت بھی پے در پے مضامین لکھ کر قرآن مجید اور عقل عام کی روشنی میں یہ ثابت کیا تھا کہ سیلاب عذاب نہیں ہوتا، اصل عذاب وہ نااہل فکری اور سیاسی قیادت ہوتی ہے جسے لوگ اپنے جذبات وتعصّبات کی بنا پر خود اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک زرعی ملک کے لیے بارشیں اور ان سے آنے والا سیلاب اللہ کی عظیم نعمت ہے۔خاص کر ایک ایسے دور میں جب دنیا میں پانی کی کمی کا مسئلہ سنگین شکل اختیار کر گیا ہو۔ سیلاب اپنے ساتھ پانی کا ایسا ذخیرہ لاتا ہے جسے ڈیموں میں جمع کر لیا جائے تو کئی برس تک پانی کی کمی کا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔سیلاب اپنے ساتھ ایسی زرخیر مٹی لاتا ہے جو مردہ زرعی زمینوں کو دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔مگر ان فوائد سے وہی قومیں فائدہ اٹھاتی ہیں جن کی لیڈر شپ مال بنانے سے زیادہ ڈیم بنانے اور واٹر مینجمنٹ کو اہم سمجھتی ہو۔

مگر جہاں دانشور سیلاب میں چھپے مواقع دیکھنے کے بجائے عذاب کی دہائی دیتے رہیں، جہاں سیاسی رہنما صرف سیلاب کے زمانے میں متحرک ہوتے ہوں وہاں ہر دفعہ سیلاب آنے پر وہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ہاں ان دو درجن سیلابوں میں ہوا ہے۔یعنی جان و مال کی بربادی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی دنیا میں ہر مصیبت میں ایک خیر پوشیدہ ہوتی ہے۔مگر یہ خیر اُسی کو ملتی ہے جو اسے لینے کے لیے تیار ہو۔باقیوں کو صرف بربادی ملتی ہے۔

ذرہ اور خلا

اگر کبھی آپ کا جانا شہر کی روشنیوں سے پاک کسی صحرائی یا پہاڑی علاقے میں ہوا ہو تو رات کی تاریکی میں آپ نے آسمان کے ہر گوشے کو تاروں سے پٹا ہوا دیکھا ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بظاہر ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوئے ان تاروں کے درمیان کھربوں میل کا خلا پایا جاتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھیں کہ سورج کا زمین سے فاصلہ تقریباً نو کروڑ میل ہے۔ جبکہ سورج کے بعد جو قریب ترین ستارہ پایا جاتا ہے وہ تقریباً 250 کھرب میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کائنات میں ستاروں کی حیثیت ذروں کی سی ہے اور ان کے درمیان موجود فاصلہ اور خلا ہمارے تصور اور گمان سے کتنا زیادہ ہے۔

یہ عالم اکبر کا معاملہ تھا۔ جبکہ عالم اصغر کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ ایک زمانے تک ایٹم کو سب سے چھوٹی چیز اور مادہ کی بنیادی اکائی سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اس کے بعد سائنس کی ترقی نے یہ بتایا کہ ایٹم متعدد چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ پہلے الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹون کی نشاندہی ہوئی اور بعد میں کئی اور ذرات سامنے آئے۔

ایٹم اور یہ تمام ذرات اتنے چھوٹے ہیں کہ سر کی آنکھ سے دیکھنا تو دور کی بات ہے، تصور کی آنکھ سے بھی ان کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم بطور مثال اگر ہائڈروجن کو لیا جائے جو کہ کائنات میں سب سے زیادہ پایا جانا والا عنصر ہے تو اندازہ کیجیے کہ سوئی کی نوک پر ہائڈروجن کے تقریباً پچاس کھرب ایٹم سما سکتے ہیں۔ اب تصور کیجیے کہ اجرام فلکی کے بیچ میں کھربوں میل کا جو خلا پایا جاتا ہے اس کو سوئی کی نوک پر سما جانے والے پچاس کھرب ایٹم بھرنا شروع کر دیں تو ان کی تعداد کتنی زیادہ ہوگی؟

پھر جیسا کہ بیان ہوا کہ خود ایٹم بھی بنیادی ذرہ نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ذرات پر

مشتمل ہے۔ اس کے مرکز میں ایک نیوکلس (Nucleus) ہوتا ہے جس میں پائے جانے والے ذرات نیوٹران اور پروٹان کو ابتدائی سائنس کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ جبکہ نیوکلس کے اردگرد الیکٹرون گردش کررہے ہوتے ہیں۔ ایٹم کے سائز سے مراد مرکزی نیوکلس اور اردگرد موجود الیکٹرون کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ نیوکلس اور الیکٹرون کے بیچ کا تمام تر علاقہ خلا پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر ایٹم کو ایک فٹ بال کے میدان کے برابر تصور کرلیا جائے، تو وسط میں ایک انگور کے برابر نیوکلس ہوگا اور میدان کی بانڈری لائن پر سوئی کی نوک جتنے چھوٹے الیکٹرون ہوں گے۔ جبکہ بیچ میں پوری جگہ خالی پڑی ہوتی ہے۔ اس کا سادہ ترین مطلب یہ ہے وہ مادہ جو جگہ گھیرنے والے ایٹم سے مل کر بنتا ہے بیشتر خلا ہی ہوتا ہے۔ اس خلا کو بھرنے کے لیے پہلے الیکٹرون کو ایٹم کا فٹبال کے میدان جتنا علاقہ بھرنا ہوگا اور پھر یہ کہیں جا کر یہ ایٹم کائنات کے خلا کو بھریں گے۔ یوں ایٹم کو بھرنے والے الیکٹرون کی تعداد اور پھر کائنات کو بھرنے والے ایٹم کی تعداد ہر شمار اور اندازے سے باہر ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کو سمجھانا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ جب رکوع سے کھڑے ہوتے تو ربنا ولک الحمد (اے ہمارے مالک حمد تیرے لیے ہی ہے) کہتے اور پھر فرماتے کہ تیری حمد آسمانوں اور زمین بھر کے ہو اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ بھر کے اور اس کے بعد جو تو چاہے وہ بھر کر تیری حمد ہو، (سنن ابوداؤد، رقم 760)۔

یہ دعا آج کی جدید سائنس کا علم رکھنے والا کوئی شخص جب اس علم کے ساتھ پڑھے گا جو اوپر بیان ہوا تو اسے اندازہ ہوگا کہ زمین بھر کا مطلب دراصل ہے کیا۔ پھر وہ اگر یہ بھی جانتا ہو کہ کائنات لامحدود طور پر بڑی ہے جس میں مادہ بہت کم اور بیشتر خلا پایا جاتا ہے تو وہ اس خلا کے بھرنیکے تصور سے لرز اٹھے گا۔ اسے احساس ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل کس

خوبی سے یہ بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ درحقیقت کس قسم کی حمد کے حقدار ہیں۔

سچ یہ ہے کہ اللہ کی حمد کسی گنتی اور کسی تصور میں نہیں آسکتی۔ ہاں اس کا قریب ترین اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ نے الیکٹران، نیوٹران اور پروٹران اور ان ہی جیسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنائی ہے۔ یہ اپنی گردش میں اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ مگر ان ذرات میں اور ان سے بننے والے اجرام فلکی کے بیچ میں لامتناہی خلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ خلا بے مقصد نہیں چھوڑا گیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب کوئی مومن ایسے ہی اللہ کی حمد کرتا ہے جیسے اوپر بیان ہوا تو اس لمحے کائنات میں موجود تمام ذرات بڑھتے ہیں اور ہر خلا کو اللہ کی حمد سے بھر دیتے ہیں۔ یہی وہ حمد ہے جو درحقیقت اللہ کا حق ہے۔

مگر بدقسمتی سے بہت کم لوگ ہیں جو اللہ کی ایسے حمد کرتے ہیں جیسا کہ اس کی حمد کا حق ہے۔ اول تو لوگوں کو غیر اللہ کی تعریفوں سے فرصت نہیں۔ کبھی اللہ کی حمد کی بھی تو بے معنی، رٹے رٹائے اور جذبات اور فہم سے عاری کچھ الفاظ کے ساتھ۔ مگر جب کبھی کوئی مومن اپنے آقا کی پیروی میں اس طرح اللہ کی حمد کرتا ہے تو اس لمحے کائنات کے سارے ذرات لامحدود خلا کو بھر کر اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ یہ حمد ہر تصور، ہر مثال اور ہر تعداد سے بلند ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے جو انسان حمد کا یہ لمحہ تخلیق کرسکتا ہے، وہی سب سے بڑھ کر اس عظیم موقع سے غافل ہے۔

عالم اور اعتماد

ایک عالم اور محقق وہ شخص ہوتا ہے جو علم کی روایت کے تمام پہلوؤں سے واقف ہوتا ہے اور پھر کسی معاملے میں اپنے فہم کے مطابق ایک رائے قائم کرتا ہے۔ عالم کا علم اور تحقیق اسے اس بات کا حقدار بناتے ہیں کہ وہ اپنی بات پورے اعتماد کے ساتھ بیان کرے اور دوسرے اہل علم کی غلطی کو واضح کرے۔ یہ ایک عالم کا حق ہے جو اس سے چھینا نہیں جا سکتا۔ مگر اس سے جو توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے نیت پر حملہ نہ کرے، ان کا تمسخر نہ اڑائے اور اس بات کے لیے تیار رہے کہ اس کی غلطی اگر اس پر واضح کر دی جائے تو وہ اپنی رائے سے رجوع کر لے گا۔ معاملات اگر یوں رہیں تو کبھی تعصب پھیلے گا نہ فرقہ واریت وجود میں آئے گی۔

خرابی اس وقت ہوتی ہے جب وہ لوگ کسی معاشرے میں عالم بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں جو علم کے صرف ایک پہلو سے واقف ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے علاوہ کسی اور نقطہ نظر کو سنجیدگی اور کھلے دل سے پڑھا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت جن بزرگوں کے نام پر وہ کھڑے ہوتے ہیں وہ ان کی علمی وراثت اور استدلال سے بھی واقف نہیں ہوتے۔

ایسے لوگ عملی زندگی میں اتر کر کبھی کسی دوسرے کا نقطہ نظر نہیں سمجھ سکتے۔ اگر کبھی دوسروں کی بات سننا بھی پڑے تو ہمدردی سے سمجھنا تو دور کی بات ہے وہ سنتے ہوئے بھی بات کا جواب سوچتے رہتے ہیں۔ یہی یکطرفہ علم بلکہ کم ترین علم کے حاملین پھر فروعی اور جزوی اختلاف کی بنیاد پر دوسرے اہل علم کی نیت بلکہ ایمان کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

یہی پہلے اور دوسرے گرہ کا حقیقی فرق ہے۔ پہلا گروہ صاحبان علم کا ہوتا ہے جو علم کی پوری روایت سے واقف ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ علم کی روایت سے تو کیا اپنے بزرگوں کی علمی روایت سے بھی واقف نہیں ہوتا۔ پہلا گروہ اگر پورے اعتماد سے کسی چیز کی تردید کر رہا ہوتا ہے تو اس کے

پیچھے ان کی علم اور تحقیق ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ جب پورے اعتماد سے کسی کی تردید کرتا ہے تو اس کے پیچھے گروہی عصبیت کارفرما ہوتی ہے۔ پہلا گروہ ایک نئ اور مختلف بات کو بھی ہمیشہ توجہ سے سنتا ہے کہ وہ پہلے ہی علم کی روایت میں بہت سے نئ اور مختلف باتوں سے واقف ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ ایک نئ اور مختلف بات سنتے ہی متوحش ہوجاتا ہے کہ اس نے ساری زندگی اپنے نقطہ نظر کے علاوہ کوئی دوسری بات سنی ہی نہیں ہوتی۔

پہلا گروہ بھی گرچہ اپنی رائے کے دفاع کے لیے تیار رہتا ہے، مگر جانتا ہے کہ اس کی رائے غلط ہوسکتی ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ اپنی رائے کو آخری حق سمجھ کر دفاع کرتا ہے۔ پہلا گروہ انسانی علم اور فہم کی محدودیت کا شکار ہو کر غلطی کر سکتا ہے، مگر واضح دلیل آنے پر اپنی رائے سے رجوع کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ دوسرا گروہ خود کو نبی اور رسول کے مقام پر سمجھتا ہے اور اپنے فہم کو وحی الٰہی خیال کر کے کسی ترمیم و تبدیلی کو کفر و ایمان کا مسئلہ بنا دیتا ہے۔

ایک عام آدمی کے سامنے دونوں گروہوں کے لوگ بظاہر دین کے نمائندوں کے طور پر آتے ہیں۔ مگر یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دو طرح کے لوگوں میں فرق کرنا سیکھے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ لہجے کے اعتماد سے دھوکہ نہ کھائے۔ بلند و بالا دعووں سے مرعوب نہ ہو۔ وہ سوال کرے اور جواب چاہے۔ وہ دریافت کرے اور دلیل مانگے۔ علما کو انسان سمجھے، نبی نہ بنائے۔

اس دنیا میں عالم اور عامی دونوں امتحان میں ہیں۔ عالم کا امتحان یہ ہے کہ علم کے تمام پہلوؤں سے ابتدائی واقفیت سے قبل کلام نہ کرے اور غلطی واضح ہوجانے پر اپنی رائے سے رجوع کرلے۔ عامی کا امتحان یہ ہے کہ وہ دونوں فریقوں میں فرق کرنا سیکھے اور علما کو نبی اور ان کی آراء کو ایمانیات نہ بنائے۔ وہ دوسرے اہل علم کو بدنام کرنے کی مہم نہ چلائے۔

علم روشنی ہے جو نظر آجاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ تعصّبات کی عینک اتار کر دیکھا جائے۔

سلسلہ روز وشب

ابو یحییٰ

ہم جنس پرستی

محترم قارئین ! انسانی تاریخ میں جس سب سے بڑی گمراہی نے انسانیت کو اپنے شکنجے میں کسے رکھا وہ شرک تھا۔ایک زمانے میں یہ گمراہی اتنی بڑھی کہ اس نے سماج اور ریاست دونوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔تنہا ایک خدا کی عبادت کرنا، سماج سے کٹ کر اپنا مذاق بنا لینے کے مترادف تھا۔ مشرکین دنیا کی ہر ریاست پر قابض تھے اپنا دین شرک بالجبر لوگوں پر نافذ کرتے۔ اگر انبیا کی رہنمائی میں کوئی فرد یا گروہ شرک چھوڑ کر توحید کی راہ اختیار کرتا تو موت کی سزا پاتا۔

تاہم کروڑوں اربوں درود وسلام ہوں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے اصحاب پر کہ ان کی بے پناہ قربانیوں نے شرک کی گمراہی اوراس کے ظلم سے ہمیں نجات دی اور قیامت تک کے لیے دین کے نام پر جبر اور اپنا خود ساختہ دین دوسروں پر ٹھونسنے کا دور ختم کر دیا۔

ایک نئی گمراہی

تاہم دور جدید میں ایک اور برائی اسی طرح عالمی طور پر ہر جگہ پھیل چکی ہے جس طرح زمانہ قدیم میں شرک عام ہوا تھا۔ یہ برائی جنسی بے راہ روی کی برائی ہے۔ دور جدید میں اب کم وبیش تمام متمدن دنیا میں یہ مان لیا گیا ہے کہ بدکاری کوئی برائی نہیں اور عفت کوئی اخلاقی قدر یا خوبی نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک دن میں نہیں ہوا۔اس کے پیچھے پچھلی کئی صدیوں کے علمی اور سماجی افکار اور صنعتی دور میں پیدا ہو جانے والا طرز معاشرت ہے۔تاہم انفارمیشن ایج سے قبل عفت کی موت مغربی سماج کا خاصہ تھی۔ مگر اب گلوبل ویلیج اور انفارمیشن ایج کے زمانے میں یہ برائی اب ساری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات کے نتیجے میں دنیا کی دیگر اہم تہذیبیں

یعنی چینی، ہندی، مسلم تہذیبیں بھی تیزی سے بدکاری کو بطور ایک قدر کے معاشرتی زندگی کا حصہ بنا رہی ہیں۔ یہ بظاہر اب نصف صدی ہی کی بات ہے کہ مغربی دنیا کی طرح باقی دنیا میں بھی زنا عام ہو جائے گا اور عفت و عصمت کا تصور اسی طرح اجنبی ہو جائے گا جس طرح زمانہ قدیم میں توحید کا تصور ہو چکا تھا۔

جنسی بے راہ روی کے اس سیلاب کے کئی دھارے ہیں۔اس کا ایک نیا دھارا جسے مغرب میں بھی حال ہی میں سماجی اور قانونی قبولیت حاصل ہوئی ہے ہم جنس پرستی ہے۔ پہلے یورپ اور اب نارتھ امریکہ میں بھی ہم جنس پرستی کو سماجی اور قانونی سطح پر قبول کر لیا گیا ہے۔گرچہ آج بھی اس کی مخالفت کئی حلقوں کی طرف سے کی جاتی ہے، مگر یہ تنقید اور مخالفت پوری طرح موثر نہیں رہی ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم

انسانی سماج کبھی کسی برائی کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ فکری طور پر اس کے حق میں فضا ہموار ہو۔ہم جنس پرستی کی سماجی اور قانونی سطح پر قبولیت کی اصل وجہ پوسٹ ماڈرن ازم کے وہ افکار ہیں جن کے مطابق انسانی جذبات اور خواہشات کو عقلی تصورات پر فوقیت حاصل ہو چکی ہے اور انسانی اقدار کی قدر و قیمت اضافی قرار دے دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اقدار اور معقولیت جیسی چیزیں اپنی قدر کھو دیتی ہیں تو پھر معاشرے میں ہر قسم کے انحراف کا دروازہ کھل جاتا ہے۔یہی ہم جنس پرستی کے معاملے میں ہوا ہے۔

جدید دنیا میں اب یہ مان لیا گیا ہے کہ افراد اپنی ذاتی زندگی میں باہمی رضامندی سے جو کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی۔رہا سماج تو اس سے نمٹنے کے لیے یہ استدلال تخلیق کیا گیا ہے کہ بہت سے افراد کے لیے یہ کوئی انحراف نہیں ہوتا بلکہ

ان کی جینیاتی اور نفسیاتی ساخت کی بنا پر یہ ان کے لیے عین فطری طریقہ ہے۔

مخالفین کے استدلال کی ناکامی

مغرب میں اتنی آسانی سے اس فعل کو قبول عام حاصل نہیں ہوا ہے۔ روایتی اور مذہبی حلقوں کی طرف سے اس میں بڑی مزاحمت ہوئی ہے۔ لیکن آخر کار ان کے استدلال کو شکست ہوئی۔ مذہبی استدلال سے مراد یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور مذہبی قانون میں اسے ہمیشہ ایک بہت بڑا جرم سمجھا گیا ہے۔ قوم لوط کا واقعہ چونکہ بائبل کی ابتدا ہی میں بیان ہوا ہے اور یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایت میں ہم جنس پرستی کو ایک بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کا گناہ ہونا ایک مسلمہ تھا۔ تاہم اہل مذہب کی اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے مذہبی اعتقادات اور معیارات کو مغرب میں بہت پہلے ہی شکست ہو چکی تھی۔ اس لیے جب اس بنیاد پر ہم جنس پرستی کی مخالفت کی گئی تو اس کی کوئی خاص شنوائی نہیں ہوئی۔

مغربی سماج میں اصل رکاوٹ فطری استدلال تھا۔ یعنی انسانی فطرت اس چیز کو قبول نہیں کرتی اور اسے ہر حال میں ایک انحراف خیال کرتی ہے۔ پھر انسان کے سامنے جنسی تعلق کی اصل بنیاد یعنی مرد و عورت کا نکاح کے ذریعے اپنے جذبات کی تسکین کا راستہ اس قدر واضح طور پر کھلا ہوا ہے کہ عام حالات میں لوگ خود ہی ایسے انحرافات سے دور رہتے ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جن معاشروں میں مرد و زن کو ہر طرح کی جنسی آزادی بے روک وٹوک دے دی جائے تو وہاں یہ انحراف خود بخود جگہ پا لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا جنسی جذبہ لامحدود طور پر طاقتور ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تکمیل لذت کے نہیں بلکہ تعارف لذت کے اصول پر بنائی ہے۔ چنانچہ مذہب نے نکاح کے قانون اور دیگر کئی ذرائع سے انسانوں کے اس جذبے پر پابندیاں لگا کر ان کی یہ تربیت کی ہے کہ وہ اسے خود پر سوار نہ ہونے دیں۔

مگر جن معاشروں میں جنسی جذبہ کو ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پھر انحرافات جنم لیتے ہیں۔ تکمیل لذت کی خواہش میں انسان اندھا ہو کر ہر بند دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم جنس پرستی بھی ایسا ہی ایک بند دورازہ ہے جسے کھولنا بہت سے لوگوں کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ یہی مغرب میں بھی ہوا۔ وہاں لوگوں نے تکمیل لذت کی خاطر اس بند دروازے کو بھی کھول ڈالا۔

تاہم پھر فطرت سے لڑنے کے لیے انھیں اس کی اخلاقی اور عقلی توجیہ کرنی پڑی۔ وہ توجیہ یہ تھی کہ بہت سے لوگوں کے لیے اپنی جینیاتی اور نفسیاتی ساخت کی بنا ہم جنس پرستی ہی عین فطرت ہے اور یہ کسی قسم کی کوئی بیماری یا انحراف نہیں۔ مزید یہ کہ معاشرے کو یہ باور کرایا گیا کہ اگر اسے سماجی سطح پر کوئی برائی سمجھا گیا تو اس کا بہت برا اثر ان لوگوں کی نفسیات پر پڑے گا۔ سب سے بڑا اور مضبوط استدلال یہ کیا گیا کہ ہم جنس پرستی بعض جینیاتی وجوہات کی بنا پر کچھ لوگوں کے لیے عین فطرت ہے۔ یہ اگر ان کی فطرت ہے تو انھیں اس سے ہٹانا ان پر بدترین ظلم ہے۔ پھر مزید یہ بھی بار بار بیان کیا گیا کہ ہم جنس پرست دوسروں سے زیادہ اچھے انسان، قانون پسند، پرامن شہری ہوتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس تواتر کے ساتھ دہرائی جاتی رہیں کہ آخر کار مغربی سماج قانون اور اقدار کی سطح پر یہ مان لیا کہ ہم جنس پرستی ایک نارمل رویہ ہے۔ چنانچہ 1990 میں ولڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) نے اسے ذہنی امراض کی فہرست سے نکال دیا۔ جس کے بعد ایک ایک کر کے تمام مغربی ممالک، جنوبی امریکہ ممالک، کینیڈا اور امریکہ میں انفرادی ریاستیں ہم جنس شادی کو باقاعدہ قانونی قبولیت دیتے چلے جارہے ہیں۔

ہم جنس پرستی کے خلاف ہمارا مقدمہ

زنا کی طرح ہم جنس پرستی بھی مشرقی اور اسلامی معاشروں میں اجنبی نہ تھی۔ صرف اسے عقلی

اور اخلاقی جواز حاصل نہ تھا۔ تاہم اب انٹرنیٹ کے ذریعے اس کے جواز پر مبنی لٹریچر چونکہ عام ہو چکا ہے اس لیے ہمارے ہاں اسے تیزی سے فروغ مل رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ نہیں کہ اس چیز کے خلاف نفرت آمیز گفتگو کی جائے بلکہ ضروری ہے کہ ہم استدلال کی سطح پر مذہب کا مقدمہ لوگوں کے سامنے رکھیں۔

اس سلسلے کی پہلی گزارش یہ ہے کہ ہم جنس پرستی کے حق میں جینیاتی اور نفسیاتی بنیادوں پر یہ استدلال کرنا کہ یہ کچھ لوگوں کے لیے عین فطری رویہ ہے، ہر اعتبار سے ایک غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود میں ابھی تک کوئی ایسا جین دریافت نہیں ہوا جو یہ طے کرتا ہے کہ کسی شخص کے جنسی رجحانات کیا ہوں گے۔

کیا یہ جینز کا مسئلہ ہے؟

اس معاملے میں مغرب میں ابھی تک کسی gay gene کی تلاش پر بحثیں اور تحقیق جاری ہے۔ جو چیز ابھی مرحلہ تحقیق پر ہو اور اس کے بارے میں متضاد باتیں سامنے آ رہی ہوں اس کی بنیاد پر کسی چیز کو عین فطرت قرار دے دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ایک مسلمہ علمی اور سائنسی حقیقت ہے کہ جنسی رجحانات صرف جینز ہی سے طے نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے ساتھ انسانی جسم میں کام کرنے والے ہارمون، انسانی کی ابتدائی تربیت و حالات اور سماجی اثرات کا بھی بہت اثر ہوتا ہے۔ اس لیے صرف جینز کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا ویسے ہی درست نہیں ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ تربیت کی بنیاد پر اپنے بنیادی نفسیاتی رجحانات بشمول جنسی رجحانات کو بھی طے کر لیتی ہے۔ اس کی ایک بہت سادہ اور عام مثال یہ ہے کہ عام لوگ اجنبی خواتین کے برعکس اپنی محرمات میں کوئی جنسی کشش محسوس نہیں کرتے۔ یہ کوئی فطرت نہیں ہے بلکہ یہ تربیت اور ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ کسی عام مرد کے جنسی رجحان کا رخ اس کی

اپنی ماں، بہن یا بیٹی کی طرف سے ہٹا دیتا ہے۔ حالانکہ ان کے جینز میں تو سر تا سر عورت کی کشش موجود ہوتی ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ تربیت اور ماحول کے اثرات جینز پر بھی غالب رہتے ہیں۔ اس لیے جب تک کوئی شخص نفسیاتی طور پر، کسی بھی وجہ سے، ہم جنسی پرستی میں ملوث ہونے کے لیے تیار نہ ہو اس کے جینز اسے زبردستی ہم جنس پرستی میں مبتلا نہیں کر سکتے نہ اسے اس کی فطرت بنا سکتے ہیں۔ ہاں وہ خود نفسیاتی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے تو پھر جینز کچھ بھی کہتے رہیں، آدمی یہ کر کے ہی دم لیتا ہے۔

چنانچہ یہ فطرت والی بات بس ہوائی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ارتقا کے حامی اخبارات و رسائل میں ہر ہفتے ادھر اُدھر کی کوئی نہ کوئی چیز شائع ہوتی رہتی ہے۔ ایسی چیزیں کسی شخص کو اپنے نقطہ نظر پر اعتماد تو دے سکتی ہیں، مگر علم کی دنیا میں اسے کسی مسلمے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کا حیوانی وجود

جو لوگ جنیاتی اور فطری بنیادوں پر ہم جنس پرستی کے حق میں دلائل دیتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو کس خلقت پر پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جینز کے ساتھ ایک جسم بھی دیا ہے۔ مرد و زن کے مختلف جینز ان کے جسم کو ایک خاص جسمانی ساخت دیتے ہیں۔ اس مختلف حیوانی ساخت میں یہ جینز اور مرد و زن کا حیوانی وجود پکار پکار کر یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنا ہے۔ ظاہر ہے کہ حیا مانع ہے کہ اس حقیقت کی تفصیل بیان کی جائے مگر انسان جانتا اور سمجھ سکتا ہے کہ مرد کا جسم مرد کے لیے اور عورت کا جسم عورت کے لیے نہیں بنایا گیا۔ صنف مخالف ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے میں فطری اور ہمہ وقت کشش محسوس کرتے ہیں۔ جب یہ نکاح کے تعلق سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑے فطری طریقے سے اولاد کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس کے بعد عورت کا پورا انسانی وجود

بچوں کی تخلیق اور پرورش کی فیکٹری بن جاتا ہے۔ وہ اسے اپنے اندر پروان چڑھاتی، جنم دیتی، اپنے اندر سے اس کی غذا کا بندوبست کرتی اور اس ننھی کونپل کو اپنے نرم ہوا سے زیادہ لطیف وجود سے جلا بخشتی ہے۔ یہ فطرت ہے۔ یہی عین فطرت ہے۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس کے علاوہ کہیں اور سے فطرت اور جینز کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انسانی جینز مرد و زن کے اعضا اور انسانی فطرت مرد و زن کے مزاج میں چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ سیدھا راستہ یہاں ہے۔ فطرت کے اس سیدھے راستے کو چھوڑ کر کہیں اور جانے والے لوگ انحراف ہی کا شکار ہوتے ہیں۔ خالق فطرت نے جب اس حوالے سے انسانوں کو اپنی منشا سے براہ راست آگاہ کرنا چاہا تو اپنے جلیل القدر پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام کی زبانی کلام کیا۔ ان کی قوم اس فعل بد میں ذوق و شوق سے مبتلا تھی۔ چنانچہ ان کے اس جاہلانہ فعل سے انھوں نے اس طرح اظہار براءت کیا:

”کیا تم لوگ عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! بلکہ تم بڑے ہی جاہل ہو!“ (النمل 55:27)

یہ آیت اس ضمن میں پیدا ہونے والی ایک اور غلط فہمی کو رفع کرتی ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک قوم لوط کا اصل جرم ہم جنس پرستی نہیں بلکہ اس فعل بد پر جبر تھا۔ یہ استدلال اس واقعے سے کیا جاتا ہے جس کے مطابق حضرت لوط کے ہاں فرشتے نوجوان لڑکوں کی شکل میں آئے تو یہ لوگ ان کو زبردستی حضرت لوط کے مکان سے نکالنے کے لیے آ گئے۔ لیکن یہ آیت حضرت لوط کی زبانی یہ واضح کررہی ہے ان کا اصل جرم اپنی عورتوں کے بجائے مردوں سے شہوت رانی کرنا تھا۔ یہی بات ایک دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے۔

”کیا تم خلق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ اور تمھارے رب نے تمھارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑتے ہو۔ بلکہ تم لوگ نہایت ہی حد سے گزر جانے

والے لوگ ہو۔ وہ بولے کہ اے لوط! اگر تم باز نہ آئے تو تم لازماً یہاں سے نکال چھوڑے جاؤ گے۔ اس نے کہا، میں تمہارے اس عمل سے سخت بیزار ہوں۔ اے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو ان کے عمل کے انجام سے نجات دے۔''، (الشعراء 25:165-169)

فرشتوں والا واقعہ اتمام حجت کے لیے پیش آیا۔ اس لیے کہ رسولوں کے باب میں اللہ کا یہ قانون ہے کہ اتمام حجت کے بعد بھی وہ کسی قوم پر ہاتھ اسی وقت ڈالتے ہیں جب قوم رسول پر چڑھائی کر دے۔ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ پر حملہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے اور نتیجے کے طور پر فوراً اس قوم کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی قوم لوط کے ساتھ ہوا کہ انھوں نے لڑکے نظر آنے والے فرشتوں کی خواہش میں حضرت لوط کے گھر پر چڑھائی کی اور جواب میں عذاب آ گیا۔

[نوٹ: یہ مضمون جاری ہے اور اس کی آخری قسط اگلے ماہ شائع ہو گی]

پروفیسر محمد عقیل

فحاشی اور اسلامی تعلیمات

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے رشتے میں ایک عمومی حرمت قائم کی ہے یعنی عورت اور مرد کے آزادانہ جنسی اختلاط پر پابندی لگائی ہے۔اس پابندی کے دو مقاصد ہیں۔ایک تو یہ کہ ایک ایسی سوسائٹی قائم ہو جس کی بنیاد آزادانہ جنسی تعلق کی بجائے نکاح کے اصول پر ہو تا کہ ایک مضبوط خاندانی نظام کو فروغ دیا جاسکے۔اس پابندی کا دوسرا مقصد انسان کو آزمانا ہے کہ کون اپنے نفس کے منہ زور تقاضوں کو لگام دے کر خدا کی اطاعت و بندگی اختیار کرتا ہے اور کون اپنے نفس کو آلودہ کر کے اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔

جونہی انسان کی زندگی کا آغاز ہوا، انسان کے ازلی دشمن شیطان نے انسان پر یلغار کر دی اور اسے راہ راست سے بھٹکانے کے لئے الٹے سیدھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ان چالوں میں ایک اہم منصوبہ یہ تھا کہ انسان کو بے حیائی اور برہنگی کی جانب راغب کیا جائے۔ چنانچہ جب حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو جنت میں بھیجا گیا تو شیطان نے سب سے پہلے انہیں درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تا کہ وہ اپنے رب کی نافرمانی کا ارتکاب کرنے کے ساتھ ساتھ بے لباسی اور برہنگی کا شکار ہو جائیں۔ اس کے بعد جب حضرت آدم وحوا نے اس درخت کا پھل چکھ لیا تو اس کا نتیجہ اسی برہنگی کی صورت میں سامنے آیا۔یہ ساری تفصیل قرآن مجید کی سورۃ الاعراف کی آیات 20 تا 22 میں بیان ہوئیں ہیں۔

پھر جب اللہ نے حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو اس دنیا میں بھیجا تو انسانیت کو خبردار کر دیا کہ شیطان اس دنیا میں بھی سب سے زیادہ جہاں سے حملہ آور ہوگا وہ یہی بے لباسی اور بے حیائی ہی ہوگی:

”اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں فتنے میں مبتلا کر دے جیسا کہ اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوا دیا تھا اور ان سے ان کے لباس اتروا دیئے تھے تا کہ ان کی شرمگاہیں انہیں دکھلا دے۔ وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا سرپرست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔“، (الاعراف 22:7)

عفت کی اہمیت

شیطان کی اس دراندازی اور نفس کے منہ زور تقاضوں کے باعث اللہ تعالیٰ نے فطرت اور وحی دونوں کے ذریعے انسان کو عفت اختیار کرنے کی واضح اور بین ہدایات دی ہیں۔ فحاشی کی ابتدا مرد و عورت کے غلط رویئے اور طرز عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ابتدا ہی سے درست اور حیا پر مبنی رویہ اختیار کیا جائے تو بے حیائی کی روک تھام آسان ہے۔

اسی لیے قرآن میں بیان ہوتا ہے:

”(اے نبی! مومن مردوں سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں پست رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور مومن عورتوں سے بھی کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو از خود ظاہر ہو جائے۔ اور اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں اور اپنے بناؤ سنگھار کو ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے جوان کے خاوند، باپ، خاوند کے باپ (سسر)، بیٹے، اپنے شوہروں کے بیٹے (سوتیلے بیٹے)، بھائی، بھتیجے، بھانجے، میل جول والی عورتیں، کنیزیں یا جن کی وہ مالک ہوں، اور اپنے خادم مرد جو عورتوں کی حاجت نہ رکھتے ہوں اور ایسے لڑکے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ

ہوئے ہوں۔ اور اپنے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے اور اے ایمان والو! تم سب مل کر اللہ کے حضور توبہ کرو توقع ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔" (النور 24 : آیات 31-30)

ان آیات میں زنا کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے مرد اور پھر خواتین کو ہدایت دی گئی کہ میل جول کے وقت اپنی نگاہیں پست رکھیں یعنی ان میں پاکیزگی پیدا کریں۔ پھر دونوں کو ہدایت دی گئی کہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یعنی انہیں چھپانے، پوشیدہ رکھنے اور حیا اختیار کرنے کے اقدام کریں اس کے ساتھ ساتھ شرمگاہوں کو صرف شریعت کے بیان کردہ دائرہ میں استعمال کریں۔ تیسری ہدایت خواتین سے متعلق ہے جس کی وجہ خواتین کی جسمانی ساخت ہے۔ اس میں یہ ہدایت ہے کہ مخلوط جگہوں پر خواتین اپنے سینے کو نامحرموں کے سامنے ڈھانپنے کا اہتمام کریں اور اسی کے ساتھ ایسے کوئی اقدام نہ کریں کہ لوگوں میں جنسی طور پر رغبت پیدا ہو جیسے چھن چھن کرتے ہوئے پائل کے ساتھ مردوں کی محفل سے گذرنا، لگاوٹ بھری باتیں کرنا، متوجہ کرنے والی خوشبو لگانا، نامناسب لباس پہننا وغیرہ۔

اسی بات کو ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

زید بن طلحہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ ہر دین کا ایک وصف ہے اور اسلام کا وصف حیاء ہے۔ (موطا امام مالک: جلد اول: حدیث نمبر 1545)

فحاشی کی ممانعت

عفت و حیا کو مثبت طور پر بیان کرنے کے بعد فحاشی و بے حیائی پر قدغن لگا دی گئی تا کہ معاشرے کو اس قسم کے کسی بھی اثر سے پاک رکھا جائے۔ قرآن و حدیث میں فحاشی کی واشگاف الفاظ میں ممانعت بیان کر دی گئی ہے تا کہ کسی قسم کا کوئی ابہام نہ رہے۔

قرآن:

قرآن میں فحاشی کی مذمت مختلف پیرایوں میں کی گئی ہے۔

۔اللہ تعالٰی نے کسی ابہام کے بغیر یہ بتا دیا کہ فحاشی کو اللہ نے حرام کر دیا ہے خواہ ان کی نوعیت پوشیدہ ہو یا ظاہر کی ہو:

'فحاشی کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ یہ کھلی ہوں یا چھپی ہوں' (الانعام 151:6)

۔جنسی تقاضے کی شدت اور اہمیت کی بنا پر اللہ تعالٰی نے انسان کو خبر دار کر دیا کہ شیطان یہیں سے وار کرے گا۔اس بات کی اہمیت کی بنا پر قرآن نے جگہ جگہ یہ بتایا ہے کہ شیطان فحاشی و عریانی کے ذریعے انسانیت کو گمراہ کرنے کے درپے ہے۔

''وہ (شیطان) تو تمھیں برائی اور فحاشی کا ہی حکم دیتا ہے۔''،(البقرہ 169:2)

ایک اور جگہ بیان کیا:

''اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ کیونکہ وہ فحاشی اور برا راستہ ہے۔''(بنی اسرائل 32:17)

۔زنا کی شناعت کی بنا پر خود اللہ نے قرآن میں زنا کرنے والوں کی سزا مقرر کر دی جو اسلامی حکومت دے گی:

''زانی عورت ہو یا مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو درے لگاؤ، اور اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے معاملہ میں تمھیں ان دونوں (میں سے کسی) پر بھی ترس نہ آنا چاہئے۔ اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو ان کی سزا کے وقت موجود ہونا چاہئے۔''(النور 2:24)

۔زانی سے اس قدر سخت بے زاری کا اظہار کیا کہ اللہ نے زانی کا نکاح کسی مومن سے کرنے کو منع فرما دیا اور زانی کو مشرک کے برابر لا کھڑا کیا:

''زانی نکاح نہ کرے مگر زانیہ یا مشرکہ عورت کے ساتھ، اور زانیہ کے ساتھ وہی نکاح کرے جو خود زانی یا مشرک ہو۔ اور اہل ایمان پر یہ کام حرام کر دیا گیا ہے۔'' (النور 3:24)

۔ زنا کو اللہ نے شرک اور قتل جیسے دو گناہوں کے ساتھ بیان کیا ہے جن کی سزا ابدی جہنم ہے:

''اور اللہ کے ساتھ کسی اور الہٰ کو نہیں پکارتے نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو شخص ایسے کام کرے گا ان کی سزا پا کے رہے گا۔'' (الفرقان 68:25)

۔ بڑے گناہ اور فحاشی سے بچنے پر اللہ نے مغفرت کی نوید سنائی ہے:

''جو کبیرہ گناہوں اور فحاشی کے کاموں سے بچتے ہیں اِلا یہ کہ چھوٹے گناہ (ان سے سرزد ہو جائیں) بلاشبہ آپ کے پروردگار کی مغفرت بہت وسیع ہے۔'' (النجم 32:53)

شمائلہ عثمان

مجرب نسخہ

اکمل صاحب پچھلے دوسال سے شدید پریشانی کی حالت میں تھے ان کا ایک بیس سال پرانا کریانہ اسٹور تھا جو علاقے کا سب سے پرانا اور کسی زمانے میں اکلوتا ہونے کی وجہ سے خوب چلتا تھا۔لیکن دوسال قبل سامنے ہی اصغر صاحب نے ایک اسٹور کھولا جو مختصر عرصے میں ترقی کرکے منی مارکیٹ کی شکل اختیار کرگیا تھا۔اکمل صاحب کی پریشانی کی وجہ وہی اسٹور تھا جس کی وجہ سے علاقے میں ان کی ساخت بری طرح متاثر ہورہی تھی انہوں نے بہت جتن کیے دعائیں وظیفے صدقات لیکن نقصان بڑھتا ہی چلا جارہا تھا کبھی مال کی ڈلیوری میں مشکلات، گاہکوں کا دن بدن کم ہونا پرانے ملازمین کا چھوڑکر چلا جانا حتیٰ کہ نوبت قرضوں تک جا پہنچی۔کئی بہی خواہ اصغر صاحب کی جانب اشارہ دے چکے تھے کہ انہوں نے بندش (کالاعلم) کروادیا ہے تب ہی برسوں پرانا چلتا ہوا کاروبار ٹھپ ہوگیا ہے۔کافی عرصے تک تو اکمل صاحب بندش ختم کروانے کے چکر میں وقت اور پیسہ لٹاتے رہے۔پھر کسی نے یہ بات ذہن میں ڈالی کہ الٹا کوئی عمل (کالاعلم) اصغر صاحب پر کردیا جائے جس سے ان کا کاروبار ٹھپ ہوجائے تو گاہک دوبارہ واپس آجائیں گے۔اکمل صاحب میں ہزار اخلاقی خرابیاں سہی لیکن ان کا دل کالے علم کی طرف مائل نہ ہوا وہ جانتے تھے کہ یہ شرک ہے سو وہ ایمان کا سودا کرکے کافر بننے کے لئے تیار نہ تھے۔کچھ زیادہ راسخ العقیدہ تو نہ تھے لیکن بہر حال ماں باپ نے بچپن سے نماز کی عادت ڈال دی تھی۔

پیروں فقیروں آستانوں پر چڑھاووں سے مالی حالت مزید پتلی ہوگئی چڑ چڑا پن شدید غصہ اور گالم گلوچ میں مزید اضافہ ہوگیا گھر کا ماحول بھی کشیدہ ہوگیا، بیوی بچے سہمے سہمے رہتے۔ہر شخص انہیں اپنی تباہی کا ذمہ دار نظر آرہا تھا۔ایک دن اچانک مجیب صاحب کا خیال آیا جو پیچھے

محلے میں رہتے تھے ریٹائرسرکاری ملازم تھے۔ محلے میں صاحب دانش اوراہل علم کے طور پر جانے جاتے تھے اور لوگوں کی مشکلات میں ان کی روحانی مدد فرماتے تھے۔

مجیب صاحب اکمل صاحب سے واقف تھے کچھ عرصہ پہلے تک سودا ان کی ہی دکان سے لیتے تھے اس لیے اکمل صاحب کو ان سے ملاقات میں قطعی کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی وہ ان کے گھر پہنچ گئے اور تمام روداد سنائی مجیب صاحب کمال کے نبض شناس آدمی تھے، ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بیماری کی جڑ تک پہنچ گئے ہیں۔ اب انہوں نے علاج شروع کیا لیکن شرائط پہلے ہی بتا دیں یعنی پابندی، غور وفکر اور یکسوئی کے ساتھ قرآن پاک بلاناغہ ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھنا چاہے دو آیتیں ہی کیوں نہ پڑھی جائیں، پاک صاف باوضو رہنا نماز بغیر قضا کیئے پابندی سے پڑھنا اور کسی بھی وقت ایک تسبیح کلمہ طیبہ اور ایک تسبیح استغفار کی پڑھنا پڑھتے وقت غور وفکر اور یکسوئی لازمی ہے اور آخر میں عاجزی سے گڑگڑا کر اللہ کے حضور دعا کرنی ہے، 40 دن کا عمل ہے، بظاہر نسخہ مشکل نہ تھا نماز تو عادتاً پڑھتے ہی تھے، لیکن اکثر فجر میں کوتاہی ہوجاتی تھی تو اس کی پابندی میں مشکل پیش آئی باقی تسبیح چٹکی بجاتے ہوجاتی قرآن پڑھنے کی باری رمضان میں آتی تو اس کی بھی پابندی شروع کردی لیکن اس میں مزہ آنے لگا آدھا، پونا پارہ روز پڑھ لیتے 40 دن چٹکی بجاتے ہی گزر گئے کاروباری حالات تو نہ بدلے لیکن غصہ اور چڑ چڑا پن کم ہوگیا۔ دوبارہ مجیب صاحب کے پاس گئے اور حالات بیان کئے انہوں نے جواب دیا عمل میں غور وفکر اور یکسوئی کی کمی ہے وہ پورا ہوتے ہی کام بننے شروع ہوجائیں گے۔

اب اکمل صاحب نے قرآن نماز اور تسبیحات غور وفکر سے پڑھنی شروع کی شروع میں تو کچھ محسوس نہ ہوا لیکن آہستہ آہستہ دل کی دنیا تبدیل ہوگئی۔ قرآن پڑھتے ہوئے محسوس ہوا اللہ تعالیٰ بیشتر جگہوں پر ان ہی سے مخاطب ہے، کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی

ہیبت طاری ہو جاتی جو کلمہ بچپن سے پڑھا لیکن اسے محسوس اب کیا جب دل میں خوف خدا نے گھر کرلیا تو باہر کی دنیا نئے ڈھنگ کی نظر آئی لہجے میں نرمی اور شائستگی آ گئی، گالم گلوچ غائب ہو گئی۔

اب صبح فجر کی نماز کے بعد تسبیحات پھر قرآن بمعہ ترجمہ تفسیر غور وفکر سے پڑھنے کے بعد نیند غائب ہو جاتی سیدھے اسٹور کا رخ کرتے اور کاروبار زندگی کی ابتدا کرتے، اصغر صاحب کا اسٹور آدھا دن گزار کر کھلتا اور آدھی رات تک چلتا۔ جب صبح صبح اسٹور کھولا تو دوسری چوائس نہ ہونے کی وجہ سے گاہکوں کی آمد شروع ہوئی کچھ جان میں جان آئی۔ پہلے جو پوری دنیا اپنی بربادی کی ذمے دار نظر آرہی تھی استغفار کا ورد کرتے ہوئے اپنی کوتاہیاں کمزوریاں اور خرابیاں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں پہلے جو ناپ تول میں ڈنڈی مارتے تھے وہ فوراً ختم کیا فون کال پر ہوم سروس کی سہولت شروع کی مہینے بھر کی خریداری پر ڈسکاؤنٹ آفر رکھیں مال کی کوالٹی پر خصوصی توجہ دی سپلائر کی ادائیگی وقت پر کی جس سے مال کی ڈیلیوری آسان ہو گئی دو شفٹوں میں ملازم رکھے جن کے ساتھ نرمی کا برتاؤ اختیار کیا اور اضافی منافع کی صورت میں بونس دینے کا اعلان کیا جس کی وجہ سے ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوا منافع کی شرح بہت معمولی رکھی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے کاروبار میں برکت ہونے لگی، اب اپنی ترجیحات کا تعین کر کے پہلے قرض کی ادائیگی پھر اسٹور کو جدید سہولتوں سے آراستہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

اب نہ یہ پرانے اکمل صاحب تھے نہ پرانا جیسا کاروبار، اب اکمل صاحب نماز پڑھنے والے نہیں نماز قائم کرنے والے بن گئے، قرآن پاک پڑھنے والے ہی نہیں اس سے ہدایت لے کر عمل کرنیوالے بن گئے۔

فرح رضوان

بچے ہمارے عہد کے (2)

موت کا فرشتہ، روح قبض کرنے کے لیے عموماً اچانک سے نہیں آ جاتا، بلکہ بذریعہ قاصد ہمیں پیغامات مل رہے ہوتے ہیں. عمر کے ساتھ ساتھ بالوں کا سفید ہونا، جسم اور بینائی اور دانتوں کا کمزور ہونا، سب واپس روانگی کی جانب اشارہ کر رہے ہوتے ہیں لیکن بے برکت وقت میں اس پر دھیان دینے کی فرصت کسے ہے؟ اور مصروف زندگی کی بھاگ دوڑ کے باعث اسی قسم کی لاپرواہی اکثر والدین اپنے بچوں کو پروان چڑھانے کے دوران بھی کر رہے ہوتے ہیں جس کے پیچھے فقط ایک سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ ابھی بچہ ہے، بڑا ہو کر سیکھ جائے گا۔

گھر کا پرانا درخت بھی اگر پھیکے یا کم پھل دینے لگے تو فورا اس کی جڑوں کو آکسیجن پہنچانے کا انتظام کیا جاتا ہے. جڑوں میں کھاد، پانی اور گڑ ڈالا جاتا ہے، مگر جس جگہ سب سے زیادہ گراس روٹ پر کام کرنے کی ضرورت ہے وہاں وقت گنوا دیا جاتا ہے۔

وقت گزرنے پر تو سبھی جانداروں میں جسمانی تبدیلی آ جاتی ہے۔ بیج پودا اور پھر درخت بن جاتا ہے، میمنا بکری بن جاتا ہے، بچھڑا گائے بن جاتا ہے، یہاں تک کہ انڈہ بھی اگر فرائی ہو کر لقمۂ اجل بننے سے محفوظ رہ پائے، تو مرغ مسلم تک عروج پا تا ہے، لیکن انسان کے بچے کے لیے یہ سوچنا، کہ تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا، انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا، اس وقت تک تصور ہی رہے گا جب تک کہ کوئی جی جان سے اس کی کردار سازی پر محنت نہ کرے گا۔

ٹیکنالوجی کے اس دور میں ہم چھ ماہ کے بچے کو کارٹون اور i pad سے متعارف کروانا تو کبھی نہیں بھولتے، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے وقت، والدین سے قبل شیطان ان کی اولاد تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی پسلیوں میں اپنی انگلیاں چبھا کر اسے رلاتا ہے، اللہ تعالیٰ

کی عزت کی قسم کھا کر اپنے وعدے پر قائم کہ انسان اور اس کی اولاد کو نرم غذا کی طرح کھا جائے گا اور بہکا کر ہی دم لے گا۔

آج وہ دور آ گیا ہے کہ اگر ایک مرغی انڈوں پر بیٹھتی ہے تو اس کے پاس بھی ہمارے مقابلے میں بہت وقت ہوتا ہے، کہ وہ اپنے انڈے کو الٹے پلٹے، سہلائے چمٹائے، دانہ دنکا کھا کر لوٹے، اور پھر بیٹھ جائے۔

لیکن! انسان کے بچے کی پرورش کے لیے شروع کے تین سے پانچ سال کے سوا کوئی بہترین وقت نہیں۔ اگر اس وقت کو درست استعمال کر لیا تو پھر یہی بنیاد نہ صرف مضبوط ستونوں کا موجب بنے گی، بلکہ اس پر ہی بلند عمارات بھی تعمیر ہو سکیں گی۔ اسی صاف ستواں کینوس پر انشااللہ ڈھیروں خوبصورت رنگ ابھریں گے۔

ہم اکثر، منہدم پلوں ٹوٹی سڑکوں اور ٹریفک جام کا رونا روتے ہیں، کیونکہ یہ رکاوٹیں اور دشواریاں ہماری منزل تک پہنچ کو کٹھن اور ناممکن بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح سے والدین کا آپس میں ٹوٹا ہوا تعلق، یا ان کا اپنے رب سے بے ربط رہنا، بچوں کی منزل کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ کیونکہ والدین ہی تو وہ پل ہیں، جو اس دنیا میں اپنے بچوں کو، اگلے جہان سے متعارف کرواتے ہیں۔ اور جہاں بچوں کو اللہ سے محبت اور اس کی ناراضگی کے خوف کا احساس دلانا ضروری ہے، وہیں شیطان کی انسان سے ازلی دشمنی اور اس کے ہتھکنڈوں کو سمجھانا بھی بہت اہمیت کا حامل ہے، بلکہ صحیح معنوں میں تو ہمیں شیطان کے traps اور tactics کو جاننے اور گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تب ہی تو ہم اپنے بچوں کو اس سے بچانے کے قابل ہو سکیں گے۔ ساتھ ہی والدین کا بچے سے تعلق ہر غلط بات پر صرف ڈانٹ ڈپٹ، مار دھاڑ اور ہنگامہ آرائی کا ہی نہ ہو بلکہ ایسا ہونا چاہیے کہ بچہ اپنی بڑی سے بڑی غلطی کو بھی آپ سے چھپانے کے

بجائے، آپ کو اپنے پیچیدہ ترین مسائل کا بہترین کاؤنسلر سمجھتا ہو۔

اکثر بچوں کو وسوسے بہت پریشان کرتے ہیں۔اتنے فضول تصورات اور نا قابل بیان باتیں ذہن میں آتی ہیں کہ وہ مونہہ نہیں کھول پاتے، اور بے سبب باغی ہوتے دکھائی دیتے ہیں، جب کبھی بھی براہ راست بات بنتی نظر نہ آئے تو ایسی صورت میں قصے اور کہانیوں کے ذریعے ان سے مکالمے کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔جبکہ کچھ بچوں کو با قاعدہ جسمانی شکل میں کوئی کردار (شیطان) دکھائی دیتا ہے، جو ان کو حکم دیتا اور دھمکاتا رہتا ہے اور رازداری پر مصر رہتا ہے۔اس وقت ان کو ایک بہترین مددگار کی اشد ترین ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ ایک تنہا معصوم بچہ بہت حوصلہ کر کے والدین کو یہ بات بتا رہا ہوتا ہے۔اول تو یہ کہ ان کی بات پر یقین کیا جائے کہ حقیقتاً اس کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔دوسرا اس سے نجات کا راستہ، جو اس بچے کو ناممکن لگ رہا ہوتا ہے، اس کے لیے کسی عامل کی نہیں بلکہ آپ کے ایمان کامل، جس میں عقل و حکمت بھی ہو شامل، کی ضرورت ہے۔کیونکہ یہی تو وہ وقت ہے جب بچے کا ایمان پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے کہ اس برے کردار سے نہ ڈر کر، آپ سے مشورہ کرنے کے باعث، اللہ سے دعا مانگنے کے سبب، صرف لاحول پڑھنے سے، یا صرف سورۂ بقرہ کی تلاوت سے یا صرف اَعوذُ باللہ ہی پڑھتے رہنے سے یا معوذتین اور آیت الکرسی کے ورد کی برکت سے اس کی اتنی بڑی آفت ،مصیبت، پریشانی، خوف، دھڑکا، خدشہ، اذیت، آزمائش، کشمکش اور ہیجانی کیفیت، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی۔

خوشی سب کچھ پا لینے کا نام نہیں
یہ پائے ہوئے میں خوش رہنے کا نام ہے (ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (12)

دلائل آخرت: قدرت کی دلیل

دلیل قدرت کا خلاصہ

ہم نے پچھلی قسط میں میں دلائل آخرت کے ضمن میں قدرت کی دلیل کا بیان شروع کیا تھا۔ قرآن مجید نے یہ دلیل تین پہلوؤں سے پیش کی ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱) ان انسانی مشاہدات کو سامنے رکھ کر جن میں انسان ہر روز مردہ چیزوں کو زندہ ہوتے دیکھتے ہیں۔

۲) انفس و آفاق میں جو کچھ موجود ہے اس صناعی و کاریگری کی عظمت کو سامنے رکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ تخلیق کا اتنا مشکل اور اتنا نازک معاملہ پہلی دفعہ کیا جا سکتا ہے تو دوبارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

۳) اللہ کے علم و قدرت کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھنا جو یہ بتاتے ہیں کہ مرنے والے انسانوں کے لیے فنا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت سے وہ کسی طور باہر نہیں نکلتے، اس لیے وہ جب چاہے گا انھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔

ان میں سے پہلے پر تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ان گنت مظاہر ہیں جو ایک نوعیت کی موت سے گزر کر بار بار زندہ ہوتے ہیں اور ہر انسان ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جیسے مردہ زمین کا زندہ ہونا، انسان کا ہر روز نیند سے بیدار ہونا اور اجرام فلکی کا غروب ہو کر طلوع ہونا۔ یہ سب بتاتے ہیں اللہ کی دنیا میں مردہ ہونے کے بعد زندگی، موت کی بے ہوشی کے بعد بیداری اور نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد دوبارہ طلوع ایک معمول کا

واقعہ ہے۔ ایسے قادر مطلق رب کے لیے مردوں کا زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہب کی تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں مردہ حیوانی وجود کو زندہ کر کے اللہ نے خود لوگوں کو دکھایا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے مردوں کو زندہ کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درخواست پر مردہ پرندوں کو زندہ کرنا اور اصحاف کہف کا صدیوں بعد زندہ کیا جانا۔ ایسے صاحب قدرت خدا کے لیے تمام انسانوں کو ایک روز زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟

تخلیق اول اور تخلیق عالم سے استدلال

دلیل قدرت کا دوسرا پہلو اس حقیقت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت جب بغیر کسی نقشے اور مثال کے پہلی دفعہ تخلیق کا عمل کر سکتی ہے تو دوسری دفعہ تخلیق کرنا کیا مشکل کام ہے۔ عقل و شعور رکھنے والا ہر انسان اس چیز کو سمجھ سکتا ہے کہ کسی بھی چیز کو پہلی دفعہ بنانا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ جب کوئی چیز بن کر سامنے آجائے تو دوبارہ اس کو اسی صورت پر پیدا کرنا نسبتاً بہت آسان کام ہے۔ مثلاً ایک مکان کی جب تعمیر کی جاتی ہے تو پہلی دفعہ نقشہ ہوتا ہے نہ اینٹ گارا، زمین سامنے ہوتی ہے نہ لوہا اور پتھر۔ مگر بنانے والا جب عزم کر لیتا ہے تو وہ زمین ڈھونڈتا، نقشہ ترتیب دیتا، معمار اکھٹے کرتا، اسباب جمع کرتا اور گھر کو تعمیر کر کے رہنا بسنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر کسی حادثے یا زلزلے وغیرہ میں یہ گھر ڈھے جائے تو دوبارہ نسبتاً کم محنت سے مکان کی تعمیر نو کا یہ کام کر لیا جاتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ وجود انسانی کا ہے۔ انسان کی دوبارہ پیدائش کا کوئی لاکھ انکار کرے، پہلی پیدائش کا منکر تو نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انسان پر ایک وقت وہ گزرتا ہے جب وہ عدم محض ہوتا ہے۔ کوئی اس کا نام جانتا ہے نہ اس کا نشان ہی کہیں موجود ہوتا ہے۔ پھر ایک روز اس کے ماں باپ کے اکھٹے ہونے سے انسان کی داغ بیل پڑنا شروع ہوتی ہے۔ انسان اپنی زندگی

کا یہ سفر ایک قطرہ آب سے شروع کرتا اور بتدریج مختلف مراحل سے گزر کر انسان کامل کے روپ میں دنیا میں آجاتا ہے۔ یہ پورا واقعہ اپنی ذات میں ایک ناقابل یقین واقعہ اور ایک معجزہ ہے۔ مگر چونکہ یہ معجزہ ہر روز ہوتا ہے اس لیے کسی کو عجیب نہیں لگتا۔ اب جس نے یہ واقعہ پہلی دفعہ ممکن بنایا ہے، وہ اگر یہ کہے کہ میں یہ کام دوبارہ کرسکتا ہوں تو اس میں ایسی کون سی عجیب بات ہوگئی ہے۔ بلکہ جیسا کہ بیان ہوا۔ یہ دوسری تخلیق تو زیادہ آسان کام ہے۔ قرآن مجید تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتا ہے کہ نہ صرف انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا بلکہ اس کی انگلیوں کی پور پور کو دوبارہ ویسا ہی بنا دیا جائے گا جیسا کہ وہ دنیا میں تھی۔ اس میں ایک بڑی لطیف بات یہ پوشیدہ ہے کہ انگلیوں کی پوروں پر موجود فنگر پرنٹ ہر انسان کی جداگانہ شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو جیسا کہ وہ تھا بعینہٖ دوبارہ پیدا کر دیا جائے گا۔

قرآن مجید صرف انسان کی تخلیق اول کو بطور استدلال پیش نہیں کرتا بلکہ ساتھ میں ایک دوسری حقیقت کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان جس کائنات اور جس ارض و سماء میں زندہ ہے، وہ اپنی ذات میں کہیں زیادہ بڑی اور پیچیدہ تخلیق ہے۔ جس رب کی قدرت کاملہ نے اس کائنات اور آسمان و زمین کی ہر شے کو پیدا کیا ہے، اس سے یہ کیسے بعید ہے کہ وہ انسان جیسی معمولی چیز کو دوبارہ نہ پیدا کرسکے۔

چنانچہ انسانوں کی یہ تخلیق اول اور زمین سے آسمان تک پھیلی یہ دنیا اور اس کی تخلیق اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ ایسے صاحب قدرت رب کے لیے انسانوں کو دوبارہ جی اٹھانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔

نگرانی علم اور قدرت کی مثال: تاروں بھرے آسمان سے

دوبارہ تخلیق میں ایک اگلا سوال یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ مان لیا کہ مکان دوبارہ بن سکتے ہیں۔

مان لیا کہ انسان بھی دوبارہ بن سکتے ہیں۔مگر انسان کو جی اٹھانا تو اپنی ذات میں کوئی کام نہیں۔ اس دوبارہ زندگی کا مقصد تو حساب کتاب ہے۔وہ کیسے ہوگا؟ کیوں کر ہوگا؟ دنیا میں کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے تو ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔کسی کام پر جزا دی جاتی ہے تو اس کارنامے کے دس گواہ ہوتے ہیں۔یہ آخرت میں گواہی ثبوت کا یہ معاملہ کیسے ہوگا؟

اس کا جواب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں یہ دیتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نگرانی وحفاظت کے ایک مستقل انتظام میں جی رہا ہے۔یہ نگرانی اتنی غیر معمولی ہے کہ انسان کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا مگر اس کو ریکارڈ کرلیا جاتا ہے۔ذرہ برابر کسی اچھائی یا برائی کا انسان ارتکاب نہیں کرتا،مگر قیامت کے دن وہ اس کو اپنے نامہ اعمال میں موجود پائے گا۔کراماً کاتبین انسان کے ہر عمل سے واقف ہیں اور اسے اس کے نامہ اعمال میں نوٹ کرتے رہتے ہیں۔یہ فرشتے ہی نہیں بلکہ انسان کی اپنی جلد اور اس کے اعضاء تک قیامت کے دن اس کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے۔

قرآن مجید کے اس دعویٰ پر اگلا سوال یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ یہ تو عالم غیب کی باتیں ہیں۔ہم کیسے مان لیں کہ ہم براہ راست کسی نگرانی کے نظام میں زندہ ہیں۔اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن مجید اس اشکال کا جواب بھی دیتا ہے۔وہ نگرانی کے اس نظام کو سمجھانے کے لیے تاروں بھرے آسمان کو گواہی میں پیش کرتا ہے۔

یہ مثال یوں تو ہر دور انسان کے لیے قابل فہم ہے لیکن زرعی دور کے اس انسان کے لیے تو بہت زیادہ موثر تھی جو سارا دن کھلے آسمان تلے کھیت کھلیان میں کام کرتا،بھیڑ بکریوں کو چراتا، بازار میں خرید دفروخت کرتا اور تجارتی کارواں میں دور دراز سفر کرتا تھا۔دن بھر کی تکان سے نڈھال ہوکر رات کے وقت جب یہ انسان ٹھنڈی ہوا کے لیے کھلے آسمان تلے سونے کے لیے

لیٹتا تو اس کی نگاہوں کے سامنے سب سے بڑی چیز تاروں بھرا آسمان ہوتا۔ یہ آسمان وہی تھا جو دن بھر اس پر سایہ فگن رہا لیکن دن کے برعکس رات میں اس آسمان پر جگمگاتے تاروں کا راج تھا۔ یہ تارے آسمان کی وہ منور نگاہیں تھیں جو دن میں اس کی نظر سے اوجھل کر دی گئی تھیں۔ انسان سارا دن اس احساس میں رہا کہ صاف و شفاف نیلگوں آسمان میں کچھ نہیں۔ اس پر کوئی نگرانی نہیں۔ انسان کا جو دل چاہا وہ اس نے کیا اور یہ حقیقت بھول گیا کہ مستقل اس کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ رات کے وقت جگمگاتے تارے آسمان کی آنکھیں بن کر، نگرانی کی ایک زندہ تمثیل بن کر اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ آسمان کی وہ روشن نگاہیں ہیں جو اسے مستقل تک رہی تھیں مگر خود روشنی کے پردے میں مستور رہیں۔ رات کے وقت اصل حقیقت اس کے سامنے کھل کر آ گئی ہے۔ انسان درحقیقت ستاروں کی ان لاتعداد نگاہوں کی مستقل زد میں تھا۔ یہ نگاہیں اسے مستقل دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ایک ایک عمل کو محفوظ کر رہی تھیں، مگر وہ ان کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اب نیند کی آغوش میں جانے سے قبل اس نے دیکھ لیا کہ یہ سب اس پر نگران تھیں۔

یہ بے مثال تمثیل نگرانی کے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ نظام کو بہترین طریقے پر انسان کے سامنے کھول دیتی ہے۔ تم ہر حال میں نادیدہ نگاہوں کی زد میں ہو۔ اس وقت وہ نگاہیں تمھیں نظر نہیں آ رہی، مگر موت کی آغوش میں لیٹتے ہی جب تمھارا منہ آسمان کی طرف ہوگا۔ تم دیکھ لو گے کہ تمھاری نگرانی کرنے والے کون تھے۔

قرآنی بیانات

مذکورہ بالا مفاہیم قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں۔ انسان کی تخلیق اول سے تخلیق ثانی کی دلیل قرآن مجید میں بہت زیادہ دہرائی گئی ہے۔ چند مقامات درج ذیل ہیں۔

"تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا۔ پھر وہ تم

کوموت دیتا ہے پھر زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' (البقرۃ 28:2)

''اے لوگو! اگر تم دوبارہ جی اٹھنے کے باب میں شبہ میں ہو تو دیکھو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر منی کے ایک قطرے سے، پھر ایک جنین سے، پھر ایک لوتھڑے سے، کوئی کامل ہوتا ہے اور کوئی ناقص۔ ایسا ہم نے اس لیے کیا تاکہ تم پر اپنی قدرت وحکمت اچھی طرح واضح کر دیں اور ہم رحموں میں ٹھہرا دیتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک مدت معین کے لیے۔ پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں، پھر ایک وقت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے بعض پہلے ہی مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچتے ہیں تا آنکہ وہ کچھ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے۔ (الحج22 :5)

''کہہ دو ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے۔''، (یسین 36 :79)

''انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے! وہ پیدا کیا گیا ہے ذرا سے اچھلتے پانی سے جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے۔ بے شک وہ اس کے لوٹا سکنے پر پوری طرح قادر ہے۔''، (الطارق86 :8-5)

جبکہ تخلیق کائنات سے انسان کی تخلیق ثانی پر اس طرح استدلال کیا گیا ہے۔

''کیا انہوں نے نہیں سوچا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ قادر ہے کہ ان کے مانند پھر پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ ظالم انکار ہی پر اڑے رہے۔ (بنی اسرائیل 17 : 99)

''کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کرنے پر قادر نہیں! ہاں وہ قادر ہے اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس

کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔(یسین 36:83-81)

اللہ تعالیٰ کی قدرت علم اور نگرانی کا بیان بعض مقامات پر اس طرح کیا گیا ہے۔

''کیا ان کا گمان ہے کہ ہم ان کے رازوں اور سرگوشیوں کو نہیں سن رہے؟ ہاں (ہم سن رہے ہیں) اور ہمارے فرستادے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔''،(الزخرف 4:80)

''ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھٹلاتے ہو۔ حالانکہ تم پر نگران مامور ہیں، دبیرانِ گرامی۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''   (انفطار 82:12-9)

انسان کی دوبارہ بعین تخلیق کا بیان ایسے کیا گیا ہے۔ [سر کیا یہ لفظ ''بعینہٖ'' نہیں ہے؟]

''کیا انسان نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر پاویں گے! ہاں، ہم جمع کریں گے اس طرح کہ اس کے پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔''   (قیامہ 75 :4-3)

جبکہ تاروں بھرے آسمان سے اس غیبی نگرانی اور اس سے قیامت پر استدلال کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

''آسمان گواہی دیتا ہے اور رات میں نمودار ہونے والے بھی۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں رات میں نمودار ہونے والے! دمکتے ستارے! یہ سب گواہی دیتے ہیں ہر جان پر ایک نگہبان مقرر ہے۔''،(الطارق 86 :4-1)

''گواہی دیتا ہے برجوں والا آسمان اور وہ دن بھی جس کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے اور دیکھنے والے اور جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، یہ سب گواہی دیتے ہیں (کہ قیامت ہو کر رہے گی)۔''

(البروج 85 :3-1)

[جاری ہے]

سوال و جواب

ابو یحییٰ

حج بدل

سوال: السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ سر آج آپ سے ''حج بدل'' کے حوالے سے سوال کرنا چاہتی ہوں کہ حج بدل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس طرح کسی اور کی جگہ حج کرنے پر دونوں کو ثواب ملتا ہے؟ مطلب کہ جس کی بدلے پر حج کر رہے ہیں اُس کو اور کرنے والے کو، جبکہ جس کی جگہ حج کیا جا رہا ہو وہ حیات بھی ہو۔ اور کرنے والا اخراجات کی وجہ سے مجبور ہو مگر دل میں حج کرنے کی خواہش اور ارادہ رکھتا ہو۔ راحت عباس

جواب: دین کے تمام احکام بشرط استطاعت ہی فرض ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص اگر مالدار ہے تو اس پر زکوٰۃ لازم ہے ورنہ نہیں۔ یہی معاملہ دیگر احکام و عبادات کا اور حج کا بھی ہے۔ اس کی فرضیت بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ کچھ شرائط پر موقوف ہے۔ مثلاً مال، جسمانی طاقت اور حرم تک کے راستے کا کھلا اور محفوظ ہونا۔ یہ چیزیں نہیں تو حج فرض ہی نہیں ہوتا نہ انسان اللہ کے ہاں ماخوذ ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں ہوتے ہوئے بلا عذر حج نہیں کیا تو کسی اور کا حج کرنا اسے اس کی ذمہ داری سے بری نہیں کرا سکتا۔

تاہم روایات میں یہ بات آئی ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے مرحوم یا معذور بزرگوں کے حوالے سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے دریافت کیا تو آپ نے ان کی طرف سے حج کرنے کی اجازت دے دی۔ اصل اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حج بدل کرانا کوئی لازمی ذمہ داری نہیں ہے۔ تاہم کوئی اپنے کسی عزیز کی طرف سے کرنا چاہے تو کر سکتا ہے

گرچہ ایک دوسری روایت کے مطابق ثواب اسی کو ملتا ہے جس نے کیا ہو۔ اس روایت کے مطابق ایک عورت نے اپنے بچے کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ بھی حج کرسکتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں مگر اس کا اجر تمھارے لیے ہے۔ (مسلم 3263)۔ گویا یہ حج کا ذوق وشوق رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا اہتمام ہے کہ وہ اپنا حج کر چکے ہوں تو دوسروں کی طرف سے بھی کر لیں۔ نہ کہ کوئی لازمی دینی حکم۔

رہا وہ شخص جو مجبور ہو لیکن دل میں اجر کی امید اور خواہش رکھتا ہو تو اطمینان رکھیے کہ اس کی نیت کی بنا پر اس کو حج کا بدلہ ویسے ہی دیا جائے گا جیسے کہ حج کرنے والے کو دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے حج نہ کرنے کی وجہ اس کی غفلت نہیں بلکہ معذوری تھی اور نیت کی بنا پر وہ اجر کا مستحق ہے۔

اصول سمجھ لیں حج کی شرائط پوری نہ ہو تو لازمی نہیں، لیکن اسباب وصحت کی وجہ سے نہ جا سکیں تو نیت کے مطابق اجر ضرور ملے گا۔ لیکن صحت رخصت ہونے کے بعد پیسہ آیا یا پہلے غفلت تھی اور بعد میں احساس ہوا اور توبہ کے جذبے سے معافی بھی مانگی اور اپنی جگہ کسی اور کو بجھوایا تب بھی اچھی بات ہے۔

یہ تو قانون کی بات ہوگی۔ اب اصل اسپرٹ بھی سمجھ لیں۔ حج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شیطان اور اللہ کے لشکر میں مسلسل جنگ جاری ہے۔ ہم حج پر جا کر دراصل اس جنگ میں اپنا نام رجسٹر کراتے ہیں کہ مالک ہمیں بھی اس جنگ میں اپنی طرف سے قبول کر لے۔ یہ گویا کہ جہاد کی تمثیل ہے۔ اس جہاد میں کوئی نہ جا سکے لیکن گھر بیٹھے بھی شیطان کے خلاف لڑ رہا ہے تو اسے ان حاجیوں سے زیادہ اجر ملے گا جو وہاں جاتے ہیں اور اپنا نام اللہ کے لشکر میں لکھوائے بغیر واپس آجاتے ہیں۔ ہمیں اس اسپرٹ کو سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا چاہیے۔ تبھی حج حج ہے۔ ورنہ لوگ حج کرنے جاتے ہیں اور جیسے جاتے ہیں ویسے ہی واپس آجاتے ہیں۔

شیطانی وساوس کا علاج

سوال: سلام بھائی جان۔ جب بھی کوئی نیکی کرنے لگتا ہوں یا ارادہ کرتا ہوں تو شیطان حاوی ہو جاتا ہے مطلب کہ ایسی سہولتیں سامنے ہوتی ہیں کہ دل نہیں کرتا نماز کے لیے اٹھنے کو بھی۔ جیسا کہ انٹرنیٹ۔ نیند، فلمیں اور موبائل میسجز وغیرہ۔ زندگی میں بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جو ایک انسان کو اسلام سے دور کر دیتی ہیں جب بھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے......تو توبہ کرتا ہوں لیکن کچھ ہی وقت کے بعد ویسے کا ویسے ہی......ایسا کوئی عمل قرآن وسنت سے بتائیں کہ انسان کے ذہن میں کوئی برا خیال بھی نہ آئے۔ اگر آئے تو فوراً چلا جائے۔ اور زندگی اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزر جائے۔ جزاک اللہ، وقاص احمد۔

جواب: اس طرح کے مسائل کا حل صرف اور صرف استقامت ہے۔ مثلاً نماز کا وقت آئے تو فوراً نماز پڑھ لیں۔ یہی معاملہ گناہ سے بچنے کا ہے کہ اس کے لیے قوت ارادی کو استعمال کریں۔ یہ بات کہ دل میں برا خیال نہ آئے تو ایسی کوئی چیز قرآن وسنت میں نہیں۔ برا خیال تو آئے گا۔ مگر آپ کو اس سے جنگ کرنا ہوگی۔ جنت اسی کا بدلہ ہے۔ ہاں گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کر لیں۔ جب تک توبہ کرتے رہیں گے۔ گناہ کا جذبہ کم ہوتا رہے گا۔ اس کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ میری کتاب ''قرآن کا مطلوب انسان'' اس مقصد کے لیے بہت اہم ہے جس سے قرآن وحدیث کا ایک منتخب ذخیرہ ہر روز آپ کے زیر مطالعہ رہے گا اور انشاء اللہ یہ نیکی کی طرف بلانے اور گناہ سے روکنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

نماز کے ممنوع اوقات

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کرتی ہوں کہ اللہ پاک کے فضل و کرم سے آپ اور آپ کے اہل خانہ ٹھیک ہوں گے۔ میرا سورج کے طلوع وغروب کے حوالے سے ایک سوال ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان اوقات میں سجدہ کرنا منع ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ سورج کا طلوع وغروب ان اوقات میں ہوتا ہے جو اسلامی کیلنڈر میں لکھے ہوتے ہیں یا ان اوقات میں جن میں وہ طلوع وغروب ہونا شروع ہوتے ہیں۔ موجودہ دنوں میں لندن میں کیلنڈر کے مطابق فجر کا وقت 4 بجے ہے اور سورج کے طلوع کا وقت 6 بجے ہے تاہم 5:45 پر ہی روشنی بہت زیادہ ہو چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ممنوعہ اوقات میں سجدہ کرنے سے بچنے کے لیے کتنا وقت انتظار کرنا چاہیے؟، مدیحہ محمد۔

جواب: پہلے یہ سمجھ لیں کہ احادیث میں اصل ممانعت طلوع وغروب آفتاب اور عین نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے کی ہے نہ کہ سجدہ کرنے کی۔ جو لوگ سجدہ نہ کرنے کے بھی قائل ہیں وہ ان کا استنباط ہے۔ میری رائے میں سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ عین سورج طلوع یا غروب ہوتے وقت اس سے بھی اجتناب بہتر ہے۔ اصل ممانعت نماز کی ہے۔ چنانچہ ان اوقات میں نفل نمازیں نہیں پڑھنی چاہییں۔

باقی رہے کیلنڈر تو یہ سائنسی مشاہدات کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں اس لیے بالعموم ٹھیک ہوتے ہیں۔ فجر کے بعد روشنی پھیل جاتی ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ سورج طلوع ہو چکا ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو نظر آ جاتا ہے۔ بلند عمارات کی وجہ سے نظر نہ بھی آئے تب بھی جو وقت دیا ہوتا ہے وہ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ اس وقت کے پندرہ منٹ بعد جب سورج تقریباً ایک میٹر سے زیادہ اونچا ہو جائے اور اس میں پیلاہٹ آ جائے تو نوافل پڑھے جا سکتے ہیں۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (16)

میں سوچنے لگا کہ دنیا میں ہر دور کی تعمیر کردہ مسجد موجود ہے مگر خلافت راشدہ کے دور کی تعمیر کردہ کوئی مسجد موجود نہیں ہے۔ اس وقت سب سے قدیم تعمیر شدہ مسجد دمشق کی جامع بنوامیہ ہے۔ یہ مسجد 75ھ کے آس پاس تعمیر کی گئی ہے۔ خلافت راشدہ کا دور 40ھ میں ختم ہوا تھا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایران اور شام فتح ہوئے اور قیصر و کسریٰ کے محلات تعمیر کرنے والے بہترین کاریگر مسلم دنیا کا حصہ بنے۔ اگر آپ چاہتے تو ان کاریگروں سے مسجد الحرام اور مسجد نبوی کی ایسی شاندار تعمیر کرواتے جو کہ آج تک برقرار رہتی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

دور فاروقی کے بعد سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی تعمیر پر ذاتی جیب سے کچھ لکڑی کا کام کروا دیا جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت نے پسند نہیں کیا۔ اس سے خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار کی ملوکیت کا فرق نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ دور ملوکیت میں اسلام کی شان اسی میں سمجھی گئی کہ مساجد کی عالیشان عمارتیں تعمیر کی جائیں جنہیں دیکھ کر آنے والی نسلیں بادشاہ کو یاد رکھیں۔ خلفاء راشدین کا نقطہ نظر اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ حضرات عمارتوں پر پیسہ لگانے کی بجائے انسانوں پر پیسہ لگانا زیادہ پسند کیا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ عمارتوں پر پیسہ لگانے سے ان کا نام دنیا میں تو باقی رہ جائے گا مگر آخرت میں اجر پانے کے لئے انسانوں کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری ادا کرنا ضروری ہے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں آج بھی مساجد کی تعمیر و تزئین پر کروڑوں روپے لگا دیے جاتے ہیں مگر انہی مساجد کے گرد و نواح میں بسنے والے افراد کی ضروریات کا کسی کے دل میں خیال پیدا نہیں ہوتا۔

عوام کے مال میں اس قدر احتیاط کے باوجود سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس تردد میں رہا

کرتے تھے کہ آپ خلیفہ ہیں یا بادشاہ۔ایک دن غالباً سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کہا، ''اگر آپ عوام کی رقم کا ایک درہم بھی غلط طریقے سے وصول کریں یا غلط جگہ پر خرچ کریں تو آپ بادشاہ ہیں ورنہ آپ خلیفہ ہیں۔''

ہمارے اکاؤنٹنٹ حضرات سال میں ایک مرتبہ اپنے اکاؤنٹس کلوز کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے لئے حیرت کا باعث ہوگی کہ خلفاء راشدین بھی سال میں ایک مرتبہ بیت المال کی کلوزنگ کیا کرتے تھے۔اس کلوزنگ میں وہ کوئی انٹریز پاس کرنے کی بجائے بیت المال میں جو کچھ ہوتا تھا، اسے اس کے حق داروں تک پہنچانے کی پوری کوشش کرتے تھے اور کلوزنگ کے دن بیت المال میں سے ہر قسم کے مال کو اس کے حق داروں تک پہنچانے کے بعد وہاں جھاڑو دے دی جاتی تھی۔ بادشاہ سرکاری خزانے کو ظلم کے مال سے بھر کر اسے بے دردی سے لٹایا کرتے ہیں جبکہ خلیفہ اسے درست طریقے سے وصول کر کے درست جگہ پر خرچ کرتے ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ خلافت راشدہ کا عرصہ اتنا قلیل کیوں رہا۔ ہماری 1400 سالہ تاریخ میں خلافت راشدہ کا عرصہ صرف 30 سال ہے۔اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ عرصہ کل 60 سال بنتا ہے۔ بعد کے کچھ اچھے ادوار بھی خلافت راشدہ کے قریب ہیں۔ان کا مجموعہ بھی چالیس پچاس سال سے زیادہ نہیں ہے۔اس سے پہلے بنی اسرائیل کی 1500 سالہ تاریخ میں خلافت راشدہ کا عرصہ بھی 200 سال سے کم ہے۔اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالی نے امتحان کے لئے بنائی ہے۔اگر ہر طرف خلافت راشدہ کا دور دورہ ہو تو پھر امتحان کیا رہا۔ پھر تو ہر شخص ماحول سے مجبور ہو کر نیکی کرنے پر مجبور ہوگا۔انسان کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ نیکی اور بدی کے مخلوط ماحول میں اچھا رہے۔

مسجد سے باہر نکل کر ہم اینٹوں والی گلی میں چل پڑے۔ کچھ دور ایک اور شاندار مسجد نظر آ رہی تھی جس کے بارے میں نائب امام صاحب نے بتایا تھا کہ یہ دوسو سال قدیم ہے۔ اس مسجد کا نام "بایزید یلدرم مسجد" تھا جو کہ ایک عثمانی بادشاہ تھے۔ یہ مسجد سنان کے آرکی ٹیکچر کا شاہکار نظر آ رہی تھی۔ میں مسجد کے اندر چلا گیا۔ اندر سے مسجد نہایت ہی خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ مسجد کی چھت نہایت ہی خوبصورت نقش و نگار سے مزین تھی۔ زیادہ تر نیلا رنگ استعمال کیا گیا تھا۔ ترکوں نے مسجد نبوی کی تعمیر میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا چنانچہ اگر آپ ترکوں کے دور کی بنی ہوئی مسجد نبوی کے گنبدوں کا اندرونی جائزہ لیں تو کچھ ایسے ہی نقش و نگار وہاں بھی موجود ہیں۔

مسجد کے قریب ہی ایک خوبصورت فوارہ بنا ہوا تھا جس میں سے کئی رنگ نکل رہے تھے۔ ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ قریب ہی شاورما کی ایک دکان تھی جو ہمارے لئے غنیمت تھی۔ میں نے اسے خوب مصالحے دار بنانے کے لئے کچھ الٹے سیدھے اشارے کئے جسے کمال مہربانی سے وہ صاحب سمجھ گئے اور انہوں نے خوب مرچیں بھر کر شاورما بنا دیا۔ میرا خیال تھا کہ جب ہم اسے کھائیں گے تو ہمارے کانوں سے دھواں سا نکلنے لگے گا، آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ نکلے گا، زبان سے "سی سی" کی آوازیں نکلیں گی مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ شاورما بہت مزیدار تھا اور اس کی مرچیں ذائقے میں بہت مناسب تھیں۔ معلوم ہوا کہ ترکی مرچیں زیادہ تیز نہیں ہوتیں۔

ہر مشکل سے نکلنے کا ایک راستہ ضرور ہوتا ہے
اسے ڈھونڈیئے اور اگر نہ ملے تو
خود ایک راستہ بنا لیجیے (ابویحییٰ)

غزل (پروین سلطانہ حناؔ)

پسِ منظرِ خزاں بھی میں بہار دیکھتی ہوں
جو سکونِ جسم و جاں ہے وہ قرار دیکھتی ہوں

تری چشمِ وا کو دیکھوں کسی نرگسی بدن میں
کبھی پھول پنکھڑی میں رخِ یار دیکھتی ہوں

کبھی رنگِ مہروماہ میں، کبھی وسعتِ سماں میں
کبھی منظرِ شفق میں گلِ زار دیکھتی ہوں

کبھی سرمئی گھٹا سے ہے ترا جلال ظاہر
کبھی نرم گنگناتی سی پھوار دیکھتی ہوں

کبھی دن کے منظروں میں ہوئیں تجھ سے ڈھیر باتیں
تجھے رات میں بھی اٹھ کے کئی بار دیکھتی ہوں

تجھے دیکھنے کی چاہت میں جو دل میں آ بسا ہے
اسی طالبِ حقیقت کو بیمار دیکھتی ہوں

تری بخشش و عطا کے جو برس رہے ہیں موتی
انہی موتیوں کے پہنے ہوئے ہار دیکھتی ہوں

مرے شوق و جستجو کا ہے سفر ابھی ادھورا
یہ جو چڑھ رہا ہے دریا بے کنار دیکھتی ہوں

کبھی دل مرا بھر آیا، کبھی چشمِ نم کو پایا
جو خطاؤں پر ہے نادم دلِ زار دیکھتی ہوں

کہ رضائے حق سے بڑھ کر ہے حنا کوئی عبادت؟
تری بندگی کے رستے بھی ہزار دیکھتی ہوں

اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کا فیصلہ

اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔

اور زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ وہ بہت بُرا فعل ہے اور بڑا ہی بُرا راستہ۔

اور جس جان کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے، پس چاہیے کہ وہ بدلہ میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔

اور مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقہ سے، یہاں تک کہ وہ شباب کو پہنچ جائے۔

اور عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔

اور جب پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو، اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔

اور کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے۔

اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

اور دیکھ! اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنا بیٹھنا ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محروم ہو کر۔'' (بنی اسرائیل 17:39-31)